ابراہیمی مذاہب میں نظریۂ علم اور تفسیرِ نصوص

ڈاکٹر محسن نقوی
سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ. قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ. فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ" (سورۃ البقرۃ:۲:۳۱-۳۳)

ترجمہ: اور اللہ نے آدم کو سب اسماء کی تعلیم دے دی، پھر انہیں ملائکہ پر پیش کیا اور فرمایا اگر تم "صادق" ہو تو ان کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے جواب دیا: آپ کی ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا علم ہے جتنا کہ آپ نے ہمیں سکھا دیا۔ بے شک تمام علم رکھنے اور حکمت رکھنے والے تو آپ ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! ان فرشتوں کو ان سب کے نام بتا دو۔ جب آدم نے فرشتوں کو سب نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزوں کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کیا ظاہر کرتے ہو اور کیا چھپاتے ہو۔

یہ آیات نہ صرف اسلام بلکہ ابراہیمی مذاہب کے "نظریۂ علم" (epistemology) کو واضح کرتی اور اس کی ترجمان ہیں۔ اور اس نظریے سے متعلق چند امور کو واضح کرتی ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ ہی علم کا سرچشمہ ہے۔
۲- وہی حکمت کا بھی سرچشمہ ہے۔
۳- علم کا تعلق آسمانوں اور زمین (کائنات) سے ہے جو پوری طرح آشکار نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کے غیب کا علم بھی رکھتا ہے۔ جو آشکار ہے اس کا علم تو مشاہدے سے آ جاتا ہے۔
۴- آدم علیہ السلام علم دے کر نہیں پیدا کیے گئے بلکہ انہیں اشیاء کلی کا علم عطاء کیا گیا (علم وہبی)۔
۵- فرشتوں سے "اسماء" اور ان کے "مصادیق" پوچھے گئے تو وہ اس سے عاجز رہے۔
۶- فرشتوں کو بھی اتنا ہی علم ہے جتنا کہ اللہ نے دیا ہے۔
۷- آدم علیہ السلام کو "اسماء و صداقت" میں تعلق قائم کرنے کی صلاحیت عطاء کی گئی اور اس صلاحیت کا انہوں نے اظہار بھی کیا۔

ان آیات کی نحوی ترکیب یہ ہے کہ عَلَّمَ یُعَلِّمُ تعلیمًا باب تفعیل سے، "آدم" ابوالبشر کے لئے اسم معرفہ ہے۔ عَلَّمَ کا فاعل ضمیر مستتر ہے یعنی اللہ، اور "آدم" مفعول بہٖ منصوب ہے۔ "الاَسْمَآءَ" مفعول بہٖ ثانی ہے منصوب ہے، كُلَّهَا تو کید معنوی منصوب جبکہ "ھا" ضمیر متصل، محل جر میں، مضاف الیہ۔ عَرَضَهُمْ میں "ھُمْ" ضمیر جمع مذکر غائب کو کہ ذوی العقول کے لیے آتی ہے یہاں "اسماء کے مسمیات" کی طرف راجع ہے۔ عَرَضَهُم علی دکھلانا پیش کرنا۔ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ فعل امر جمع مذکر حاضر ہے۔ "ن" وقایہ ہے اور "ی" ضمیر واحد متکلم، یہ اپنے فعل اَنْبِئُوا کا مفعول بہٖ ہے۔ "اَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ" ھٰٓؤُلَآءِ بھی ذوی العقول کیلئے آتا ہے۔ اسم اشارہ ہے جمع کیلئے۔ اسماء کے مسمیات کی طرف اشارہ ہے۔ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا، اِلَّا حرف استثناء ہے جبکہ "ما" یہاں موصولہ ہے۔ عَلَّمْتَنَا فعل فاعل اور مفعول مل کر جملہ فعلیہ بن کر صلہ ہے، موصول و صلہ مل کر مستثنیٰ منہ یعنی "علم" کا ہے۔ ہمیں تو کچھ علم ہے ہی نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں علم دیا۔ "العلیم" بروزن فعیل مبالغے کا صیغہ ہے اور "الحکیم" فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ۔ اَنْۢبِئْهُمْ۔ امر واحد مذکر (انباء، یُنْبِئُ اِنْبَاءً) "ھم" ضمیر جمع مذکر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتی ہے یہاں ملائکہ کیلئے ہے، بِاَسْمَآئِهِمْ ضمیر "ھم" راجع ہے مسمیات اسماء کی طرف، فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ

بِاَسْمَائِهِمْ۔ اس کا فاعل آدمؑ ہیں۔ لَمَّا ظرف بمعنیٰ حین یہ شرط متعلق بالجواب ہے۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَکُمْ۔ "اَ" کلمۂ استفہام ہے۔ لَمْ اَقُلْ نفی حجد بلم۔ یعنی کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔ ایسی نفی اثبات کی قوت کیلئے آتی ہے۔ اِنِّی اَعْلَمُ۔ اِنَّ کلمہ تحقیق کلام ہے۔ یقیناً میں جانتا ہوں۔ "مَا تُبْدُوْنَ" کا موصولہ تُبْدُوْنَ جملہ فعلیہ ہوکر اس کا صلہ، جو کچھ کہ تم ظاہر کرتے ہو، تم ظاہر کروگے یہ صیغۂ مضارع جمع مذکر حاضر۔ اِبْدَاءٌ اِفعالٌ ہے مصدر بمعنی نمایاں طور پر ظاہر کرنا، یا ظاہر ہونا، اس کا مادہ بَدَء۔ کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ۔ ماضی استمراری جمع مذکر حاضر، تم چھپاتے تھے۔ یَکْتُمُ، کُتْمٌ باب نَصَرَ سے چھپانا، پوشیدہ کرنا۔[۱]

یہاں علماء کو مسئلہ یہ درپیش ہوا ہے کہ "هُمْ" ذوی العقول کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء نے اس اَمر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شخوص العالمین و سائرالعالم، ولو قصد قصد الأسماء بلا شخوص جازفیہ "عرضهن" و "عرضها"۔ [۲]

اسی طرح ابوالبرکات ابن الانباری نے لکھا ہے کہ : اِنَّما قال: عرضهم ولم یقل: عرضها لأنه أراد مُسَمَّیَات الأسماء و فیهم من یعقل و فیهم من لا یعقل، فغلب جانب من یعقل علیٰ جانب من لا یعقل، فجمعهم بضمیر من یعقل۔ [۳]

خلاصہ یہ کہ یہاں صرف اسماء مراد نہیں بلکہ ان کے مسمیات بھی مراد ہیں اسی لیئے ذوی العقول کی ضمیر لائی گئی ہے ورنہ مؤنث ضمیر ہی ٹھیک تھی۔ ابن الانباری نے جو یہ کہا کہ اشیاء میں کیوں کہ ذوی العقول کی کثرت ہے لہذا ان کی وجہ سے ایسی ضمیر لائی گئی ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسان کم اور دوسری اشیاء زیادہ ہیں۔ بہرحال اس کی تفصیل میں جائے بغیر ہم نے نحوی تراکیب نیز "هُمْ" و "اسماء" کے تعلق پر زور اس لیے دیا ہے کہ ان آیات میں مضمر وہ مابعد الطبعیاتی فلسفۂ علم (metaphysical epistemology) آپ کے سامنے آ جائے جس پر دیگر ابراہیمی مذاہب بھی یقین رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں درج بالا نحوی تجزیہ تفسیر نصوص میں اُس رجحان کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جو خاص طور پر مسلمانوں میں رائج ہے اور اسی پر ان کے "فہم قرآنی" کی زیادہ تر اساس ہے۔

درج بالا گفتگو سے وہی سات نکات متبادر ہوتے ہیں جو پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم اس "نظریۂ علم" کو تفسیر نصوص" کے دوسرے ذریعے "احادیث" سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تفسیر بالآثار کی نمائندہ

کتاب "تفسیر ابن کثیر" میں ان آیات کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"حضرت آدم علیہ السلام کو تمام نام بتائے یعنی ان کی تمام اولاد کے، سب جانوروں کے، زمین، آسمان پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، چرند، پرند، فرشتے، ستارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے نام۔ ابن جریر الطبری فرماتے ہیں کہ فرشتوں اور انسانوں کے نام معلوم کرائے گئے تھے کیونکہ اس کے بعد لفظ "عرضهم" آتا ہے اور یہ ذی عقل لوگوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی معقول وجہ نہیں جہاں ذی عقل اور غیر ذی عقل جمع ہوتے ہیں وہاں ذی عقل لوگوں کے اعتبار ہی سے لفظ لایا جاتا ہے۔" [۴] امام عبدالرزاق نے معمر کی سند سے قتادہ سے روایت کی ہے کہ اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام تعلیم کیے یہ سمندر ہے، یہ پہاڑ ہے، یہ فلاں چیز ہے اور یہ فلاں چیز، اس طرح ہر شئے کا نام بتایا۔ [۵] اسی طرح ایک اور روایت عبدالرزاق نے عن ابی موسیٰ روایت کی ہے: جب اللہ نے آدمؑ کو جنت سے زمین پر اتارا "عَلَّمه صنعة کل شئی۔۔۔" تو انہیں ہر شے بنانے کی ترکیب بتادی۔ [۶]

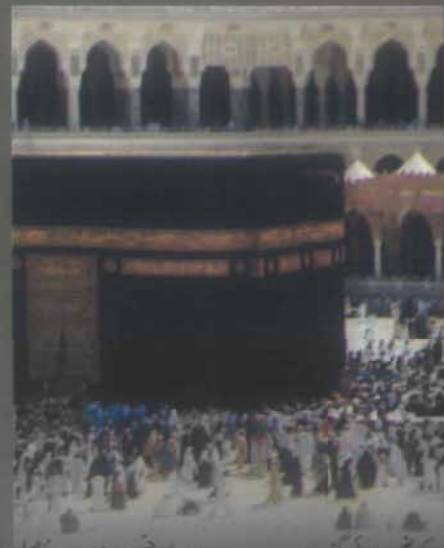

ان روایات اور تصریحات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا نظریۂ علم انسان کی داخلی واردات سے بڑھ کر "خارجی" تجربہ ہے جہاں "علم حقیقی" گویا اللہ کی طرف سے عطاء کیا جاتا ہے اور پھر انسان کی داخلی واردات یا اس کا حسی مشاہدہ دراصل اس "خارجی علم حقیقی" کے ماتحت ہوتا ہے اور جو معلومات اسے حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں انہیں یقیناً اس خارجی علم حقیقی کے مطابق ہونا چاہیئے جسے عرف عام میں "وحی" کہتے ہیں۔

اللہ کی طرف سے علم عطاء کرنے، انبیاء اور بندوں سے کلام کرنے اور ان پر وحی کرنے کا تصور قرآنِ مجید کی طرح الکتاب المقدس (بائبل) میں بھی موجود ہے۔ العهد الجدید کے "الرسالة إلیٰ العبرانیین" میں ہے: "اللّٰه بعد ما عَلَّم الآباء بالأنبیاء قدیماً بانواعٍ و طُرُقٍ کثیرة۔۔۔" [۷] یعنی: "اللہ نے قدیم زمانے میں ہمارے آباء سے انبیاء کے ذریعے بہت سے انواع اور طریقوں سے کلام کیا۔۔۔" لیکن موسیٰ علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہیں احکام عشرہ لکھے ہوئے دیئے گئے جو اللہ نے اپنی انگلیوں سے لکھے تھے۔ [۸] اور حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ جو تختیاں تم نے توڑی تھیں ان پر جو احکام درج تھے وہ دوسری دو تختیوں پر لکھو۔ [۹] کتاب مقدس میں جو مختلف صورتیں اللہ کی اپنے بندوں سے کلام کرنے یا علم دینے کی ملتی ہیں ان میں ۱۔خواب کے ذریعے [۱۰]، ۲۔بیداری کی حالت میں مشاہدے کے

ذریعے [۱۱]، ۳:لاشعوری کیفیت (trance) [۱۲] ۴: نیز فرشتوں کے ذریعے، [۱۳]۔ یہ کل چار صورتیں ہیں جو بیان ہوئی ہیں۔ مسیحی علماء نے انبیاء پر وحی ہونے یعنی انہیں اللہ کی طرف سے علم عطاء ہونے کی جو وضاحتیں کی ہیں وہ تقریباً تینوں ابراہیمی مذاہب میں مشترک ہیں۔ لیکن ہم بحث کو سمیٹتے ہوئے چند اقتباسات ابتدائی مسیحی آباء کے پیش کرتے ہیں:

مسیحی دنیا کی مشہور مقدس شخصیت جسٹین مرٹائر (Justin Martyre c.160 E) نے "علم" کے اس دینی تصور کی وضاحت یوں کی ہے: "یہ ناممکن ہے کہ تم اپنے کافر اساتذہ سے دین کی کوئی صحیح بات سیکھ سکو کیونکہ ان کے آپس کے اختلافات کے ذریعے انہوں نے تمہیں اس امر کا کافی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ وہ خود جاہل ہیں۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے آباء کی طرف رجوع کرنا خاصا معقول ہے کیونکہ انہیں تمہارے ان اساتذہ پر بہت فوقیت حاصل ہے۔ اولاً تو یہ کہ وہ وقت کے اعتبار سے پہلے ہو گزرے ہیں، دوم انہوں نے اپنی رائے سے ہمیں کچھ تعلیم نہیں کیا، سوم یہ کہ انہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور نہ ہی آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ کسی جنگ و جدل، بحث و مباحثے کے بغیر انہوں نے خدا سے وہ علم حاصل کیا جس کی انہوں نے ہمیں بھی تعلیم دی۔ نہ فطری طور پر اور نہ ہی انسانی فکر کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ جو باتیں اتنی عظیم اور الٰہی ہوں انہیں انسان جان سکے یہ صرف اس عطیے کی بدولت ہی ممکن ہے جو اوپر سے، اللہ کی طرف سے، مقدس انسانوں کو دیا جاتا ہے۔ ان حضرات کو فن تقریر کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی بات جھگڑالو و مناظرانہ انداز میں کرنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ یہ حضرات اپنے کو انتہائی ستھرے اور پاک انداز میں "الوہی روح" کے روبرو پیش کرتے ہیں تاکہ الوہی کارفرمائی خود آسمان سے نازل ہو اور ان حضرات کو آلات موسیقی کی طرح استعمال کرے۔ اس ذریعے سے "الوہی روح" ان چیزوں کا علم ہمیں دے سکتی ہے جو الوہی اور آسمانی ہیں۔ اس طرح ان حضرات نے ایک کے بعد ایک تسلسل سے آکر ہمیں تعلیم دی ہے گویا کہ ایک منہ اور ایک ہی زبان سے ادا ہو رہی ہوں۔ ان حضرات نے ہمیں خدا کے بارے میں، دنیا کی تخلیق کے بارے میں، انسان کی پیدائش، انسانی روح کے لافانی ہونے اور یوم انصاف کے بارے میں جو اس زندگی کے بعد واقع ہوگا ایک ہی طرح اور طریقے کی باتیں تعلیم کی ہیں۔" [۱۴]

ایک اور فادر اتھنا گورس (Athenagorus, C.175 E) نے لکھا ہے: "پیغمبروں کو روحانی طور پر ان کے ذہن کے عمومی عمل سے ماوراء لے جایا جاتا تھا الوہی روح کے ذریعے، اور جو کچھ اس کیفیت میں انہیں وحی کیا جاتا تھا وہی یہ بولتے تھے۔ الوہی روح ان کے ذریعے اسی طرح عمل کرتی تھی جیسا کہ بانسری بجانے والا اپنی بانسری میں پھونکتا ہے۔ [۱۵]

مشہور مسیحی عالم فادر یوسی بیس (Eusebius, C.215.W) نے فادر کائس (Caius) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو لوگ عقل انسانی سے مقدس کتابوں اور متون کی تشریح کرتے ہیں یا ان کے مفاہیم کو "ٹھیک" کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ [۱۶] اس طرح کی بیسیوں عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ابراہیمی مذاہب میں علم حقیقی کا نظریہ وحی پر مبنی اور محض خارجی ہے۔ جس طرح کتاب مقدس میں وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا، اسی طرح قرآن مجید میں بھی بعض صورتوں کو بیان کیا گیا ہے:

"وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ [۱۷]

ترجمہ: "اور کسی آدمی کیلئے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا اپنے فرستادے کے ذریعے اس پر اللہ کے اذن سے جو چاہے وحی کرے۔ بے شک وہ بلند اور حکمت والا ہے۔"

اسی طرح صحیح بخاری کی پہلی کتاب کے پہلے باب "کیف کان بدء الوحی" (وحی کی ابتداء کیسے ہوئی تھی) کی حدیث عن عائشہ رضی اللہ عنہ ہے کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا:

یا رسول اللہ کیف یأتیك الوحی؟ فقال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم): أحیاناً یأتینی مثل صلصلة الجرس وھو أشدّہ علیّ فیفصم عنّی و قد وعیت عنہ ما قال، وأحیاناً یتمثّل لی الملك رجلاً فیکلمنی، فأعی ما یقول.....

(الحدیث:۲)

ترجمہ: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آنحضرت صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: کبھی تو ایسے آتی ہے جیسے گھنٹے کی جھنکار اور یہ وحی مجھ پر بہت گراں ہوتی ہے پھر جب فرشتے کا کہا ہوا مجھے یاد ہو جاتا ہے تو یہ موقوف ہو جاتی ہے اور کبھی فرشتہ مرد کی صورت بن کر میرے پاس آتا ہے، وہ مجھ سے بات کرتا ہے اور میں اسے یاد کر لیتا ہوں۔

یہ حدیث اور کتابوں میں بھی روایت ہوئی ہے۔[۱۸]

سورۂ شوریٰ کی آیت اور اس حدیث کو ساتھ ملا کر دیکھیں تو چار صورتیں وحی کی سامنے آتی ہیں:

۱] وحی، ۲] اللہ پردے کے پیچھے سے کلام کرے، ۳] فرشتہ انسانی شکل میں آئے، ۴] گھنٹی کی جیسی آواز۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث میں بیان کردہ صلصلۃ الجرس کی کیفیت کو نمبر ایک قرار دیا جائے۔ اس طرح کل تین صورتیں سامنے آتی ہیں۔ صحیح بخاری کی اس باب کی تیسری حدیث میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رویائے صادق کا ذکر ہے اس کو ہم کتاب مقدس کی کتاب (دانیال ۱۹:۲، ۱:۷) کے تناظر میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح یہ چار یا پانچ صورتیں ہوئیں۔

جب علم اس طرح عطیۂ خداوندی قرار پائے اور معلم اوّل خود خدا کو مانا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ علوم عالیہ اور علوم آلیہ کی تقسیم میں برآمد ہوتا ہے۔ علوم عالیہ وہ ہیں جو قرآن وحدیث کہے جاتے ہیں اور علوم آلیہ وہ ہیں جو ان دونوں کو سمجھنے کیلئے آلات کا کام دیتے ہیں اور خود بالذات "علم" نہیں ہوتے بلکہ خادم ہوتے ہیں۔ مفتی تقی عثمانی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ وحی کی ابتداء وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل ختم ہوتی ہے اور حواس خمسہ کیوں کہ غلطی کرتے ہیں لہذا تیسرا اور یقینی ذریعۂ علم "وحی" ہے۔[۱۹] اسی طرح علامہ غلام رسول سعیدی نے ایک مقام پر لکھا ہے: "غرض عبادات اور معاملات کے کسی شعبے کو ہم حواس خمسہ اور عقل کے ذریعے نہیں جان سکتے اس کو جاننے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی"۔[۲۰]

یہاں ایک اہم امر پر توجہ کی ضرورت ہے وہ یہ کہ بیشتر علماء وحی کی اہمیت اور اسے یقینی ذریعۂ علم قرار دیتے ہوئے حواسِ ظاہرہ پر اپنے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہیں اور ان سے حاصل شدہ علم کو بھی غیر یقینی قرار دیتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وحی کی ہر وہ صورت جو ابراہیمی مذاہب میں تسلیم کی گئی ہے خود انسانی تجربے اور مشاہدے کے ذریعے اس دنیا سے منسلک و مربوط ہوتی ہے، نزول وحی نبی یا رسول کا ایک حسی تجربہ ہی ہوتا ہے جس کا تعلق ورود کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سے ہونا یقین کیا جاتا ہے۔

اب ہم اس نظریۂ علم کو ایک دوسرے زاویئے سے دیکھتے ہیں یعنی یہ کہ "عِلْمٌ" اور "عَلَّمَ" (فعل) کا کیا مطلب ہے اور قرآنِ مجید میں ان کا استعمال کس طرح ہوا ہے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ: "علم" يَدُلُّ عَلَى أَثَرٍ بالشَّیء يتميّز به عن غيره ...... وَالعِلْمُ نقيض الجهل" [۲۱] یعنی: اس مادے کے اصل معنی میں تمیز، پہچان، جہالت کی دوری پائی جاتی ہے۔

خلیل بن احمد النحوی لکھتے ہیں: وما علمتُ بخبرك، أي: ما شعرت به، و أعلمته بكذا، أي: أشعرته و عَلَّمْتُهُ تَعْلِيماً [۲۲]

گویا اس کے بنیادی معنیٰ شعور دینا اور باشعور بنانا ہیں۔ گویا عَلَّمَ کے معنیٰ استاد و شاگرد کا رشتہ قائم کرنا نہیں بلکہ "حصولِ علم" کی صلاحیت عطاء کرنا ہے نیز اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان کو اللہ نے علم بالفعل دیا ہے بلکہ یہ بالقوۃ ہے لہذا لوگ جاہل بھی رہتے ہیں۔ ہم یہاں صرف دو مقامات کو پیش کرتے ہیں:

۱۔ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ [۲۳]

ترجمہ: "نہایت مہربان، اسی نے قرآن تعلیم کیا، انسان کو پیدا کیا، اسے وضاحت سے بولنا سکھایا"۔

ان چار آیات میں دو (۲) مرتبہ فعل عَلَّمَ استعمال ہوا ہے۔ پہلے مقام پر اگر یہ مانیں کہ قرآن کی تعلیم بالفعل اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عطاء کی ہے تو یہ غلط ہے کیونکہ لوگ نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قبل "قرآن" کو نہیں جانتے تھے اور آپ پر بھی قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ لہذا بداہتہً یہاں ماننا پڑے گا کہ اس کا مطلب قرآن سیکھنے کی صلاحیت عطاء کرنا ہے۔ دوسرے مقام پر "عَلَّمَهُ الْبَيَان" آیا ہے۔ علامہ شریشی شرح مقامات حریری میں لکھتے ہیں:

> " البيان وضوح المعنىٰ و ظهوره، والتبيان: تفهّم المعنىٰ و تبيّنه، والبيان منك لغيرك والتّبيان منك لنفسك، مثل التبيين تقول: بيّنْتُ الشّيء لغيري بياناً و تبيّنتهُ أنا تِبْياناً۔[۲۴]
>
> ترجمہ: "بیان" اصلاً معنیٰ کے واضح ہونے اور ظاہر ہونے کا نام ہے جبکہ "تبیان" معنیٰ کو سمجھنے اور خود اپنے لئے اس کے واضح ہونے کو کہتے ہیں، "بیان" آپ کی طرف سے دوسرے کیلئے ہوتا ہے جبکہ "تبیان" آپ کا خود آپ کیلئے ہے جیسا کہ "تبین"۔ آپ کہیں گے "بَيَّنْتُ الشَّيْءَ لِغَيْرِي" میں نے شے کو دوسرے کیلئے واضح کر دیا۔ جبکہ تبیّنتهُ أنا میں نے خود اس کو سمجھ لیا اور اپنے لئے اسے واضح کر دیا۔

بیان اور تبیان کے اس فرق کو ملحوظ رکھیں اور ملاحظہ فرمائیں کہ آیہ مبارکہ میں ''بیان'' کو تعلیم کرنے کا ذکر ہے اور یہ زبان سے بھی ہوسکتا ہے اور تحریر سے بھی جبکہ ہم جانتے ہیں کہ بہت کم افراد زبانی اور تحریری ''بیان'' و وضوح پر قدرت رکھتے ہیں لہٰذا یہاں بھی ''تعلیم'' کے معنی ''بیان'' کی صلاحیت کو ودیعت کرنا ہے نہ کہ بالفعل تعلیم دینا۔

۲۔ پہلی وحی کی ابتدائی پانچ آیات میں سے چوتھی اور پانچویں آیت (۹۶۔سورۃ العلق) میں ارشاد ہے: "اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ہ" ترجمہ: ''قلم کے ذریعے علم سکھایا اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

''تفسیر جلالین'' نے "بالقلم" کی توضیح "بالخط" سے کی ہے یعنی خط اور کتابت کی تعلیم دی۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانوں میں سے اکثر لکھنا نہیں جانتے۔ علامہ صاوی اس کے حاشیے پر لکھتے ہیں:

"(الخط) أي الكتابة التي بها تعرف الأمورالغائبة و فيه تنبيه علىٰ فضل الكتابة، لما فيها من المنافع العظيمة لأن بها ضبطت العلوم، و دوّنت الحكم، و عرفت أخبارالماضين و أحوالهم و سيرهم و مقالاتهم، ولو لا الكتابة ما استقام أمرالدين ولا الدنيا، ولم يكن علىٰ دقيق حكمة الله تعالىٰ و لطيف تدبيره دليل إلّا القلم والخط لكفى فيه۔ [۲۵]

''یعنی: خط یعنی کتابت جس کے ذریعے سے غائب امور جانے جاتے ہیں۔ نیز اس آیت میں تنبیہ ہے لکھنے کی صلاحیت کی فضیلت پر کیوں کہ اس میں عظیم منافع پائے جاتے ہیں کیونکہ علوم اسی کے ذریعے ضبط اور حکمتیں اس کے ذریعے مدوّن ہوئیں اور اسی کے ذریعے گزشتہ لوگوں کے واقعات، احوال، سیرتیں اور عقائد کا پتہ چلا۔ اگر ''کتابت'' نہ ہوتی تو نہ دین کا امر مستحکم ہوتا نہ ہی دنیا کا، نیز اللہ تعالیٰ کی دقیق اور لطیف حکمت و تدبیر پر کوئی دلیل نہیں ہوتی مگر یہ کہ ''قلم اور خط'' ہی بطور دلیل کافی ہوتے''۔

اس عبارت سے صاف مترشح ہے کہ " عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ہ " کا تعلق بالفعل نوعِ انسانی کو کتابت سکھانے سے نہیں بلکہ اس صلاحیت کو بالقوۃ ودیعت کرنے سے ہے۔ اسی طرح "مَا لَمْ یَعْلَمْ" میں "ما" موصولہ مانا گیا ہے جبکہ " لَمْ یَعْلَمْ " مضارع منفی جحد بلم، صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ صلہ موصول مل کر مفعول ثانی عَلَّمَ کا ہے جو ماضی واحد مذکر غائب ہے۔ یعنی جس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

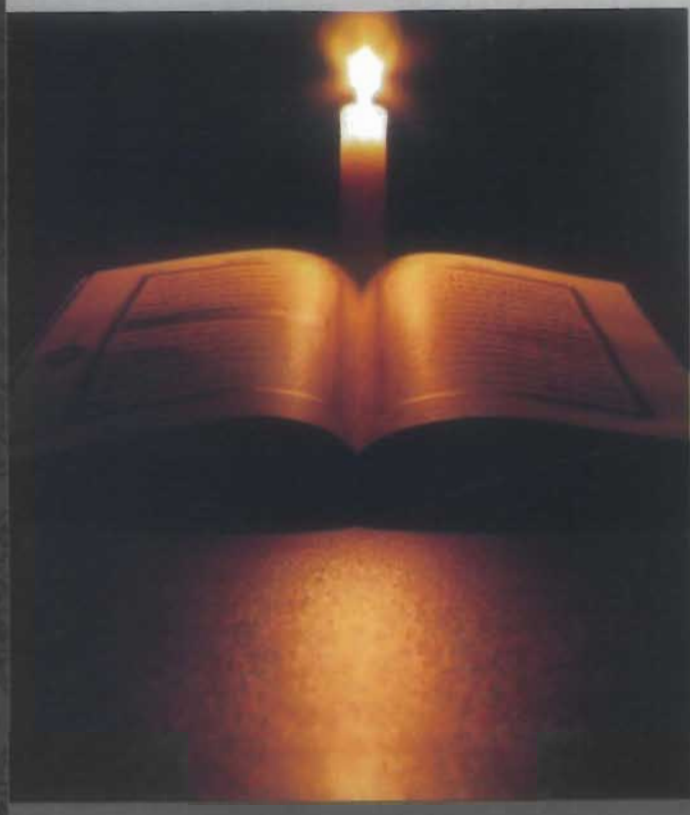

کیا واقعی اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ بنی نوع انسان کو بالفعل ہر اس چیز کی تعلیم دے دی گئی ہے جو اسے معلوم نہ تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے تو سب سے پہلے سلسلۂ ہدایت کی ضرورت کی نفی ہوتی ہے اور یہ بداہۃً بھی غلط ہے کہ انسان پہلے ہی سے سب کچھ جانتا ہے۔ برخلاف اس کے ان آیات میں "عَلَّمَ" کے معنی انسان میں سیکھنے اور سکھانے کی صلاحیت بالقوۃ ودیعت کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ مختلف علوم و فنون کو حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو ابراہیمی مذاہب کا نظریہ علم بھی بنیادی طور پر حواسِ انسانی اور ان کے محسوسات پر مبنی ہے اور انسانی تجربے میں آئے بغیر بالقوۃ صلاحیت حصولِ علم، بالفعل کیفیت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ بناء بریں ہم سمجھتے ہیں کہ ابراہیمی مذاہب کے معتقدین کے مطابق جن نصوص پر ''وحی الٰہی'' کی حیثیت سے ایمان و یقین ہے ان کی توضیح کے بارے میں ''انسانی علم و تجربے'' کے بالقوۃ موجود ہونے کو نظر انداز نہ کریں۔ اور ان ''مقدس کتابوں'' کی زبان کو ''معاشرے'' کے اندر رہ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔

حوالہ جات

(۱) تفصیل کیلئے دیکھیں: محمود صافی: إعراب القرآن و صرفه و بیانه، المجلد:۱:الجزء:۱، ص:۹۷ تا ۱۰۱، ط۔ مکتبۂ رشیدیه، کوئٹه۔

(۲) الفرّاء، معانی القرآن، ج:۱، ص:۲٦، انتشارات ناصر خسرو،طهران، ندارد

(۳) ابن الانُباری، البیان فی غریب اعراب القرآن، ج:۱، ص:۷۲، منشورات دار الهجرة، ایران، قم، ۱٤۰۳ھ

(۴) تفسیر ابنِ کثیر، تحت الآیة ۳۱۔ ۳۳من سورة البقرة، لطبري ۱:٤٥۸، تحت الآیة۔

(۵) عبدالرزاق بن همّام الصنعانی، تفسیر عبدالرزاق، ج:۱، ۲٦٥:، ح:۳۸، دارالکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۹۹ء، دراسَة و تحقیق دکتور محمود محمد عبده۔

(۶) نفس المصدر، ج:٤۲، ص:۲٦۷۔

(۷) العهد الجدید "الرسالة إلیَ العبرانیین" الأصحاح الأوّل، ۱۔ط۔بیروت۔

(۸) خروج:۳۱:۱۸۔

(۹) تثنیة، ۱۰:۱۔٥ و خروج، ۳٤:۲۷

(۱۰) دانیال،۲:۱۹: ۷:۱

(۱۱) حزقی ایل، ۱:۱، دانیال، ۸:۱، مکاشفہ، ۹:۱۷۔

(۱۲) اعمال: ۱۰:۹۔۱۷: ۱۱:۵۔۱۰: ۲۲:۱۷ تا ۲۱

(۱۳) عبرانیوں کے نام: ۲:۲ (ملائکہ)، اعمال: ۷:۵۳ (ناموس)، گلاطیوں: ۳:۱۹(ناموس و ملائکہ)

(۱۴) Justin Martyre in The Ante-Nicene Fathers [ed.Alexander Roberts and James Donaldson; 1885-1887, Vol.1, p.276, Pebody, Mass:Hendrickson, 1994)

(۱۵) Athenagorus in Ante Nicone Fathers, (ANF) Vol.2:p.133.

(۱٦) Eusabius in ANF, Vol.5, p.602

(۱۷) القرآن: ٤۲۔الشوریٰ:٥۱

(۱۸) صحیح مسلم، کتاب الفضائل،باب عرق النبي في البرد، ح: ٤۳۰۳و ٤۳۰٤ ؛ الترمذی، السنن، کتاب المناقب عن رسول اللّٰه، باب ماجاء کیف کان ینزل الوحی عن النبي، ح:۳٥٦۷؛ النسائی، السنن، کتاب الافتتاح، باب ماجاء في القرآن، ح:۹۲٤۔۹۲٥، المؤطا، الامام مالك، کتاب النداء للصلاة، باب ماجاء في القرآن، ح:٤۲٥۔ وغیرها۔

(۱۹) تقی عثمانی۔ انعام الباری، ج:۱،ص:۱۷۴۔ مکتبۃ الحراء، کراچی۔

(۲۰) علامہ غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، :ج۱،ص:۴٦، مقدمہ، ط۔فرید بک اسٹال، لاہور۔

[۲۱] معجم المقاییس في اللغة، ص:٦۸۹، دارالفکر، بیروت، الطبعة الثانیة، ۱۹۹۸ء

(۲۲) الاستاذ أسعد الطیب، ترتیب کتاب العین للخلیل بن أحمد الفراهیدی، ج:۲، ص:۱۲۷٥، انتشارات أسوة،قم، ۱٤۱٤ھ

(۲۳) سورة الرحمٰن:٥٥: ۱۔٤

(۲۴) ابو العباس الشریشی، شرح مقامات الحریری، ج:۱، ص:۱۳، مکتبة العصریة، بیروت، ۱۹۹۲ء

(۲۵) حاشیة الصاوی علیَ الجلالین، ج:۳، ص:۲۳۹۳، مکتبه رحمانیة، لاهور، نیز تفسیر القرطبی، ج:۲۰، ص:۱۲۰، انتشارات ناصر خسرو، ایران۔

اصول فقہ میں الفاظ کی بحث اور جدید لسانیاتی فلسفہ

پروفیسر ساجد حمید
ایسوسی ایٹ پروفیسر
یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور